روح کے نغمے

سیّد قطب شہیدؒ

سیّد قطب شہیدؒ (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء) کی لافانی تحریروں نے لاکھوں دلوں کو گرمایا ہے اور ان میں ایمان ویقین کی تازگی پیدا کی ہے۔ ان کی تصانیف کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سیّد قطب شہید کی ایک قیمتی تحریر افراح الروح کے نام سے ہے۔ جس میں انھوں نے متعدد اہم موضوعات پر اپنے قلبی احساسات کا اظہار کیا ہے۔ یہ اس تحریر کا اردو ترجمہ ہے۔

سیّد قطب شہیدؒ پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں جھوٹے مقدمات میں گرفتار کیے گئے۔ ۳۱/جولائی ۱۹۵۵ء کو ۱۵ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ ۱۰ سال کے بعد ۱۹۶۴ء میں انھیں رہائی ملی۔ اس نام نہاد رہائی کو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ۱۹۶۵ء میں انھیں بغاوت کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور ایک ڈھونگ نما عدالت سے فیصلہ کروا کے ۲۹/اگست ۱۹۶۶ء کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ یہ تحریر سیّد قطب نے قید وبند کے انھی ایام میں کسی موقعے پر اپنی بہن اور معروف ادیبہ امینہ قطب کے نام ایک خط کی صورت میں لکھی تھی۔ ۱۵ نکات پر مشتمل اس تحریر کے ہر نکتے کو سیّد قطب نے 'خاطرہ' کہا ہے۔ واضح رہے کہ ذیلی عنوانات محترم مترجم کے قائم کردہ ہیں۔ ادارہ

پہلا خیال: زندگی کے مقابلے میں موت کی حقیقت

موت کا تصور برابر تمھارے فکر وخیال پر چھایا رہتا ہے۔ تم اسے ہر جگہ اور ہر چیز کے پیچھے گمان کرتی ہو۔ اسے ایک ایسی سرکش قوت سمجھتی ہو، جو زندگی اور زندوں پر حاوی ہے اور اس کے مقابلے میں زندگی کو کم زور، کھوکھلی اور خوف زدہ پاتی ہو۔

تاہم، میرا نقطۂ نظر تمھارے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ میں زندگی کی ٹھاٹھیں مارتی

○ مترجم: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ہوئی، بپھری اور موج زن قوتوں کے مقابلے میں، موت کو ایک کم زور اور سکڑی سمٹی قوت سمجھتا ہوں۔ موت کچھ نہیں کر پاتی، سوائے اس کے کہ اپنی خوراک کے لیے زندگی کے دسترخوان سے کوئی گرا پڑا ٹکڑا اٹھالے۔

میرے اردگرد زندگی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ہر چیز پروان چڑھ رہی ہے، بڑھ رہی ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ مائیں حمل سے ہو رہی ہیں اور بچے جن رہی ہیں۔ اس معاملے میں انسان اور جانور برابر ہیں۔ پرندے، مچھلیاں اور کیڑے مکوڑے انڈے دے رہے ہیں، جن سے زندگی پھوٹ رہی ہے اور جان دار نکل رہے ہیں۔ زمین سے پودے پھوٹ رہے ہیں، جن سے پھل پھول نکلتے ہیں۔ آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، اور سمندروں میں موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ غرض اس روے زمین پر ہر چیز نمو پذیر ہے اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

درمیان میں کبھی کبھی موت اچانک نمودار ہوتی ہے اور ایک جھپٹّا مار کر آگے بڑھ جاتی ہے، یا چپکے سے اپنی خوراک کے لیے زندگی کے دسترخوان پر سے کوئی ٹکڑا اٹھا لیتی ہے۔ زندگی کا کارواں رواں دواں رہتا ہے۔ اس کی موجیں اچھلتی، کودتی اور جوش مارتی رہتی ہیں۔ اسے موت کا مطلق احساس ہوتا ہے نہ وہ اسے دکھائی دیتی ہے۔

بسااوقات، جب موت زندگی کے جسم کو ایک مرتبہ نوچتی ہے تو درد سے اس کی چیخ نکل پڑتی ہے، لیکن زخم بہت جلد مندمل ہوجاتے ہیں اور درد کی چیخ بہت جلد راحت میں بدل جاتی ہے۔ انسان اور حیوان، پرندے اور مچھلیاں، کیڑے مکوڑے، پیڑ پودے، سب اپنی اپنی راہ پر گام زن رہتے ہیں۔ اس طرح روے زمین زندگی اور زندوں سے معمور رہتی ہے۔ موت کہیں کونے میں دبکی رہتی ہے۔ پھر اسی دوران میں اچانک ایک جھپٹّا مارتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے، یا زندگی کے دسترخوان سے کوئی ٹکڑا گرجاتا ہے، جسے وہ اٹھالیتی ہے۔

سورج نکل رہا ہے اور غروب ہو رہا ہے، زمین اس کے گرد گردش کر رہی ہے، زندگی کی کونپلیں اِدھر اُدھر نکل رہی ہیں ـــــ ہر چیز نمو پذیر ہے۔ اضافہ تعداد میں بھی ہو رہا ہے اور نوعیت میں بھی۔ کمّیت میں بھی ہو رہا ہے اور کیفیت میں بھی۔ اگر موت، زندگی کو نگل جانے کے قابل ہوتی تو زندگی کی روانی ٹھیر جاتی، لیکن زندگی کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی، بپھری اور موج زن قوتوں کے

مقابلے میں موت ایک کم زور اور سکڑی سمٹی قوت دکھائی دیتی ہے۔ زندۂ جاوید، اللہ واحد کی قوت سے زندگی کی کونپل نکلتی ہے، یہاں تک کہ ایک تناور درخت وجود میں آجاتا ہے۔

دوسرا خیال: طویل زندگی کا راز، مقصد کے لیے جینا

ہم جب صرف اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں تو زندگی ہمیں مختصر، معمولی اور حقیر نظر آتی ہے۔ ہمارے ہوش سنبھالتے ہی اس کا آغاز ہوتا ہے اور محدود عمر کے اختتام کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ۔

لیکن جب ہم دوسروں کے لیے، یا کسی مقصد کے لیے جیتے ہیں تو اس صورت میں زندگی بہت طویل اور گہری نظر آتی ہے۔ اس کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے، جہاں سے انسانیت کا آغاز ہوا ہے اور اس روے زمین سے ہماری جدائی کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اس طرح ہم اپنی انفرادی عمر میں کئی گنا اضافہ کر لیتے ہیں۔ یہ اضافہ حقیقی معنوں میں ہوتا ہے، نہ کہ خیالی طور پر۔ اس طرح زندگی کا تصور دنوں، گھنٹوں اور لمحوں کے بارے میں ہمارے احساس کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

زندگی برسوں کی گنتی کا نام نہیں ہے، بلکہ احساسات و جذبات کا شمار زندگی سے عبارت ہے۔ اس صورت میں جس چیز کو عقلیت پسندوں کا گروہ وہم اور تصوراتی چیز قرار دیتا ہے، وہ اصل میں 'حقیقت' ہوتی ہے، ان کے تمام حقائق سے زیادہ درست حقیقت!

اس لیے کہ زندگی انسان کے شعورِ حیات کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کسی انسان سے اس کا شعورِ حیات چھین لیا جائے تو حقیقت میں وہ زندگی ہی سے محروم ہو جائے گا، اور اگر کسی انسان کا احساس اپنی زندگی کے بارے میں کئی گنا بڑھ جائے تو عملاً اس کی زندگی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ اس میں کسی بحث اور جھگڑے کی ضرورت نہیں۔

ہم جب دوسروں کے لیے جیتے ہیں تو درحقیقت خود اپنی زندگی میں کئی گنا اضافہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جس قدر دوسروں کے بارے میں ہمارے احساس میں اضافہ ہوگا، خود اپنی زندگی کے بارے میں ہمارا احساس بڑھے گا اور آخر کار خود زندگی کو ہم کئی گنا بڑھا لیں گے۔

تیسرا خیال: خیر کی مضبوطی اور 'شر' کی کمزوری

'شر' کا بیج لہلہاتا ہے، لیکن 'خیر' کا بیج پھل دیتا ہے۔ 'شر' کا درخت فضا میں تیزی سے بڑھتا

ہے، لیکن اس کی جڑیں مٹی میں گہری نہیں ہوتی ہیں۔ بسا اوقات اس کی پھیلی ہوئی شاخیں 'خیر' کے درخت تک روشنی اور ہوا نہیں پہنچنے دیتیں، جب کہ 'خیر' کا درخت سست رفتاری کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی ہیں، جو اسے گرمی اور ہوا کا بدل فراہم کرتی رہتی ہیں۔

جب ہم 'شر' کے درخت کے پُرفریب اور زرق برق مظاہر کی چکاچوند سے آگے بڑھ کر اس کی حقیقی قوت اور مضبوطی کا جائزہ لیتے ہیں، تو وہ ہمیں بہت کم زور اور خستہ دکھائی دیتا ہے، اور اس میں کوئی حقیقی پاے داری نظر نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں 'خیر' کا درخت آزمایشوں پر جما رہتا ہے، آندھی اور طوفان اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ وہ پُرسکون انداز میں دھیرے دھیرے بڑھتا رہتا ہے اور 'شر' کے درخت کی جانب سے آنے والے جھاڑ جھنکاڑ اور کانٹوں کی مطلق پروا نہیں کرتا۔

چوتھا خیال: خیر کی حوصلہ افزائی کیجیے!

ہم جب لوگوں کے دلوں میں اچھے پہلو کو محسوس کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان میں بہت کچھ خیر بھی موجود ہے، جو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتا۔

میں نے اس کا تجربہ کیا ہے۔ بہت سے لوگوں میں، میں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کے ساتھ بھی، جن کے بارے میں ابتدا میں بہ ظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شر پسند یا شعور و احساس سے عاری ہیں۔

ان کی غلطیوں اور حماقتوں پر معمولی ہم دردی کیجیے، ان سے حقیقی محبت کا تھوڑا اظہار کیجیے، ان کی دلچسپیوں اور مسائل کی جانب بغیر کسی بناوٹ کے معمولی توجہ تو دیجیے، پھر آپ ان کے دلوں میں خیر کا چشمہ پھوٹتا ہوا دیکھیں گے۔ آپ انھیں صدق و صفا اور اخلاص کے ساتھ اپنی جانب سے جو کچھ دیں گے، وہ اگرچہ مقدار میں معمولی اور حقیر ہوگا، لیکن اس کے بدلے میں وہ والہانہ پن سے اپنی محبت و مودّت اور اپنا اعتماد آپ کے حوالے کر دیں گے۔

نفسِ انسانی میں شر کی جڑیں اتنی گہری نہیں ہوتیں، جتنا ہم بسا اوقات تصور کرتے ہیں۔ اکثر اوقات تو وہ پھل کے اس اوپری سخت چھلکے کی طرح ہوتا ہے، جس کے ذریعے وہ بقا کے لیے زندگی کی جدوجہد کرتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی اندیشے سے محفوظ ہو جاتا ہے، تو وہ سخت چھلکا ہٹ جاتا ہے اور اندر سے شیریں و لذیذ گودا نکل آتا ہے۔ یہ شیریں پھل اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے، جو

لوگوں کو اپنی جانب سے امن، اپنی محبت پر اعتماد اور ان کی جدّوجہد ، پریشانیوں، غلطیوں اور حماقتوں پر حقیقی ہم دردی کا احساس دلا سکے۔

ابتدا ہی میں کشادہ دلی کے معمولی مظاہرے سے یقینی طور پر یہ سب چیزیں حاصل ہوسکتی ہیں، اور یہ اس سے قریب تر ہوگا جس کی لوگ توقع کرتے ہیں۔ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے اور اپنی ذات پر اسے برتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ خواب وخیال کی باتیں نہیں ہیں۔

پانچواں خیال: ہمدردی اور محبت کا بیج پروان چڑھایئے!

ہم اپنے دلوں میں اگر محبت، ہم دردی اور خیر کے بیج پروان چڑھالیں، تو اپنے آپ کو بہت سی مشقتوں، زحمتوں اور بے جا تکلیفوں سے بچالیں گے۔ پھر ہمیں دوسروں کی چاپلوسی کی ہرگز ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس لیے کہ اس وقت ہم ان کی مدح وثنا کرنے میں سچے اور مخلص ہوں گے۔ ہم ان کے دلوں میں خیر کے چھپے خزانوں کو پالیں گے، اور ان کی ایسی پاکیزہ امتیازی خصوصیات دیکھیں گے، جن کی صدق دل سے تعریف وتحسین کرسکیں گے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے، کہ جس میں خیر کا کوئی پہلو یا کوئی اچھی امتیازی صفت نہ ہو، جو اسے کلمۂ خیر کا مستحق بناتی ہو، لیکن افسوس کہ ہم اس سے واقف نہیں ہوتے۔ ہمیں اس کا علم اسی صورت میں ہو پاتا ہے، جب ہمارے دلوں میں محبت کا بیج پروان چڑھتا ہے۔

اسی طرح ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی کہ ان سے دل تنگ کرنے اور ان کی غلطیوں اور حماقتوں پر صبر کرنے کی مشقت برداشت کریں۔ اس لیے کہ جب ہمارے دلوں میں ہم دردی کا بیج پروان چڑھے گا، تو ان کی کم زوریوں اور خامیوں کے مواقع پر ہم ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں گے اور ان کم زوریوں سے واقف ہونے کے لیے ان کی ٹوہ میں نہیں لگیں گے۔

اس طرح فطری طور پر ہم اپنے آپ کو ان سے بغض ونفرت کی مشقت یا ان سے پہلو بچانے کی پریشانی میں نہیں ڈالیں گے۔ دوسروں سے ہماری نفرت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے دلوں میں خیر کے بیج کی نشوونما اچھی طرح نہیں ہوتی اور ہم دوسروں سے اس لیے خوف کھاتے ہیں، کیوں کہ خود ہمارے اندر خیر پر اعتماد کا عنصر کم ہوتا ہے۔

ہم خود کو کتنی طمانینت، راحت اور سکینت پہنچائیں گے، جب دوسروں کو اپنی ہم دردی اور

اعتماد کی سوغات پیش کریں گے، تو ہمارے دلوں میں محبت اور خیر کے بیج پروان چڑھیں گے۔

چھٹا خیال: حقیقی عظمت گھل مل کر رہنے میں ہے

ہم جب لوگوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں، اپنے اس احساس کی بنا پر، کہ ہماری روحیں ان سے زیادہ پاکیزہ، ہمارے دل ان سے زیادہ صاف شفاف، ہمارے نفس ان سے زیادہ کشادہ اور ہماری عقل ان سے زیادہ تیز ہے، تو یہ ہمارا کوئی کمال نہیں ہوتا، بلکہ اس طرح ہم اپنے لیے سب سے آسان راستہ اور سب سے کم زحمت کا انتخاب کر لیتے ہیں۔

حقیقی عظمت اس میں ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہیں۔ ان کی کم زوری، خامی اور غلطی پر بردباری اور ہم دردی کا بھرپور مظاہرہ کریں، اور انھیں پاک صاف کرنے، تہذیب یافتہ بنانے اور حتی الامکان اپنے معیار تک بلند کرنے کی حقیقی خواہش رکھیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے بلند اخلاق اور اعلیٰ اقدار سے دست بردار ہوجائیں، یا ان لوگوں کی چاپلوسی کریں اور ان کی گھٹیا حرکتوں پر ان کی مدح وثنا کریں، یا انھیں یہ احساس دلائیں کہ ہم ان سے برتر ہیں۔ ان متضاد امور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا اور اس راہ میں آنے والی پریشانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہی حقیقی عظمت ہے۔

ساتواں خیال: دوسروں سے تعاون چاہنا، کوئی عیب نہیں

ہم جب قدرت وصلاحیت کے ایک متعین معیار تک پہنچ جائیں گے، تب ہمیں احساس ہوگا کہ دوسروں سے مدد طلب کرنا ہمارے لیے عیب کی بات نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اُن لوگوں سے مدد طلب کرنے کی صورت میں بھی نہیں، جو ہم سے کم صلاحیت کے حامل ہوں۔

اس سے ہماری قدر و قیمت کم نہیں ہوتی کہ دوسروں سے تعاون لیں۔ ہم ہر کام اپنے دم پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات میں اپنی عار سمجھتے ہیں کہ دوسروں سے مدد چاہیں، یا ان کی جدوجہد کو اپنی جدوجہد میں شامل کرلیں۔ ہمیں اس بات میں اپنی بے وقعتی کا احساس ہوتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے، کہ ہمارے ذریعے اس چوٹی کے سر ہونے میں اُن کی مدد کا بھی دخل تھا۔ یہ سب ہم اس وقت کرتے ہیں جب ہمیں اپنے اوپر زیادہ اعتماد نہیں ہوتا، یا ہم بالفعل کسی پہلو میں

کم زور ہوتے ہیں، لیکن اگر ہم فی الواقع طاقت ور ہوں، تو ہمیں اس کا ہرگز احساس نہیں ہوگا۔ بچہ جب چلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے تو وہ اس ہاتھ کو جھٹک دیتا ہے، جو اسے سہارا دیے ہوئے ہوتا ہے۔

لیکن جب ہم طاقت وقوت کے ایک متعین معیار تک پہنچ جائیں گے، تو دوسروں کی مدد کو شکر و سپاس اور خوشی و مسرت کے جذبے کے ساتھ قبول کریں گے۔ شکر یہ اس بات پر کہ ہماری مدد کی گئی، اور مسرت اس چیز کی کہ جس پر ہمارا ایمان ہے اس پر ایمان رکھنے والے دوسرے لوگ بھی ہیں، جو جدّوجہد اور ذمے داری میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ یقین کریں کہ شعور کی ہم آہنگی پر فرحت و مسرت کا احساس بڑا پاکیزہ اور مقدس احساس ہے۔

آٹھواں خیال: ہمارے افکار کی قبولیت، مقامِ مسرت ہے

اگر ہم اپنے افکار و عقائد کو اپنے لیے خاص کیے رہیں اور جب دوسرے انھیں اختیار کرنے لگیں تو اس پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کریں اور پوری کوشش کریں کہ ان کی نسبت ہماری طرف ہی کی جائے اور دوسرے لوگ ان کے دشمن بنے رہیں۔ ایسا فعل کوئی فرد اس وقت کرتا ہے جب ان افکار و عقائد پر اس کا ایمان پختہ نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے تائید نہیں کر رہا ہوتا، بلکہ بلاارادہ وہ افکار و عقائد ظاہر ہوجاتے ہیں اور ان سے نسبت رکھنے والا انھیں اپنی جان سے زیادہ محبوب نہیں رکھتا۔

حقیقی خوشی ہی فطری نتیجہ ہے اس چیز کا کہ ہم اپنے جیتے جی اپنے افکار و عقائد کو دوسروں کی زندگیوں میں رُوبۂ عمل دیکھیں۔ محض اس بات کا تصور کہ یہ افکار و عقائد ہمارے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد دوسروں کے لیے آسودگی اور سیرابی کا ذریعہ بنیں گے، اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہمارے دل رضا، سعادت اور طمانیت سے لب ریز ہوجائیں۔

یاد رہے، صرف تاجر ہی اپنے سامانِ تجارت پر ٹریڈ مارک لگاتے ہیں، تاکہ دوسرے لوگ ویسا سامان نہ بناسکیں اور ان کے منافع کو ہڑپ نہ کرسکیں۔ رہے مفکرین، داعی اور عقائد کے حاملین تو وہ اس چیز کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کے افکار و عقائد میں حصّہ دار بن جائیں، اور ان پر اس حد تک ایمان لائیں کہ انھیں ان کے اوّلین علم برداروں کی طرف منسوب کرنے کے بجاے اپنی طرف منسوب کرنے لگیں۔

وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہی ان افکار وعقائد کے سکّہ بند 'مالک' ہیں، بلکہ وہ خود کو ان کی منتقلی اور ترجمانی کے لیے محض 'واسطہ' گردانتے ہیں۔ انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ جس سرچشمے سے وہ سیراب ہوتے ہیں، نہ وہ ان کا پیدا کیا ہوا ہے اور نہ ان کے اپنے ہاتھوں کا بنایا ہوا۔ انھیں حاصل ہونے والی خوشی ومسرت کا پاکیزہ احساس ان کے اس اطمینان کا ثمرہ ہوتا ہے کہ اس اصلی سرچشمے سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

نواں خیال: 'حقائق' اور 'فہم' میں فرق ہے

'ہم حقائق کو سمجھیں' اور 'ہم حقائق کا فہم حاصل کریں'—— ان دونوں کے درمیان بہت فرق ہے، بہت زیادہ فرق۔ اس میں پہلی چیز علم ہے اور دوسری چیز معرفت۔

پہلی بات میں ہمارا تعامل مجرد الفاظ ومعانی کے ساتھ، یا جزئی تجربات اور نتائج کے ساتھ ہوتا ہے، جب کہ دوسری بات میں ہم زندہ قبولیتوں اور کلّی مطالب کے ساتھ تعامل کرتے ہیں۔

پہلی صورت میں ہمیں اپنی ذات کے باہر سے معلومات حاصل ہوتی ہیں، پھر وہ ہماری عقلوں میں جاگزیں ہوکر امتیازی صورت میں محفوظ رہتی ہیں۔ دوسری صورت میں حقائق ہمارے اندرون سے پھوٹتے ہیں۔ ان میں خون اسی طرح دوڑتا ہے، جس طرح ہماری رگوں اور اعضا میں دوڑتا ہے اور ان کی شعاعیں ہماری نبض سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

پہلی صورت میں مختلف خانے اور ان کے ذیلی عنوانات ہوتے ہیں: علم کا خانہ اور اس کے تحت مختلف عنوانات، مذہب کا خانہ اور اس کے تحت مختلف ابواب وفصول، آرٹ کا خانہ اور اس کے تحت مختلف مناہج اور رجحانات۔ اور دوسری صورت میں صرف ایک طاقت ہوتی ہے، جو کائنات کی عظیم ترین طاقت سے مربوط ہوتی ہے، صرف ایک دھارا ہوتا ہے، جو اصل سرچشمے سے جاملتا ہے۔

دسواں خیال: اعلیٰ روحانی قوت کا حصول

ہمیں انسانی علوم کی تمام شاخوں میں ماہرین کی سخت ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کی جو اپنی تجربہ گاہوں اور دفاتر کو عبادت گاہوں اور خانقاہوں کی شکل دے دیں، جو اپنے دائرۂ اختصاص کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ صرف قربانی کے جذبے سے نہیں، بلکہ اس میں انھیں اس عبادت گزار کی طرح لذت کا بھی احساس ہو، جو اپنی روح کو بہ خوشی اپنے معبود کے حوالے

کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اس چیز کا ادراک کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو زندگی کو کوئی رُخ دیتے ہیں، یا انسانیت کے لیے کوئی راہ طے کرتے ہیں۔

رہنمائی ہمیشہ انھی لوگوں نے کی ہے اور آیندہ بھی وہی کریں گے جو اعلیٰ روحانی قوتوں کے مالک ہوں۔ یہی ہیں وہ لوگ، جو ایسے پاکیزہ شعلے کے حامل ہوتے ہیں، جس کی حرارت میں علوم و معارف کے تمام ذرات پگھل جاتے ہیں اور جس کی روشنی میں زندگی کے راستے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اعلیٰ اور بلند تر ہدف کی طرف بڑھتے ہوئے وہ تمام جزئیات سے مالا مال رہتے ہیں اور انھیں بہترین زادِ راہ حاصل رہتا ہے۔ یہ رہنما اپنی بصیرت سے اُس ہمہ گیر وحدت کا فہم حاصل کر لیتے ہیں، علم، فن، عقیدہ اور عمل جس کے مختلف مظاہر ہیں۔ چنانچہ وہ نہ تو ان میں سے کسی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور نہ کسی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

چھوٹے لوگ ہی یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف مظاہر کی ان قوتوں کے درمیان تضاد اور تصادم ہے۔ چنانچہ وہ مذہب کے نام پر علم سے برسرِ پیکار رہتے ہیں، یا علم کے نام پر مذہب سے محاذ آرا۔

یہ لوگ فن کو عمل کا نام دے کر اس کی تحقیر کرتے ہیں، یا تحریک پیدا کرنے والی قوتِ حیات کو صوفیانہ عقیدہ کہہ کر اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان طاقتوں میں سے ہر طاقت کو الگ سمجھتے ہیں، حالاں کہ وہ سب ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی ہیں، اس عظیم ترین قوت سے جس کا تسلط اس کائنات پر قائم ہے۔ لیکن بڑے رہنما اس وحدت کا ادراک کر لیتے ہیں، اس لیے کہ ان کا اس اصل سرچشمے سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ اس سے فیض اٹھاتے رہتے ہیں۔

اعلیٰ روحانی قوتوں کے حاملین کم ہیں۔ تاریخ انسانیت میں ان کی تعداد بہت قلیل ہے، بلکہ ان کا وجود نادر ہے، لیکن انھی لوگوں سے ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ جو قدرت الٰہیہ اس کائنات کی نگرانی کر رہی ہے، اسی نے ان کی صورت گری کی ہے اور طے شدہ اور مطلوبہ وقت میں انھیں بیدار کیا ہے۔

گیارھواں خیال: فہم سے بالاتر چیزوں کے بارے میں مناسب رویہ

خرقِ عادت چیزوں، کشف و کرامات اور غیر مرئی قوتوں پر ہی اعتقاد کو مطلق تسلیم کرنا خطرناک ہے۔ اس لیے کہ وہ خرافات تک لے جاتا اور زندگی کو بہت بڑے وہم میں مبتلا کر دیتا

ہے۔لیکن اس اعتقاد کا مطلق انکار کرنا بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ اس لیے کہ یہ چیز 'نامعلوم' تک رسائی کے تمام دروازوں کو بند کردیتی اور ہر اَن دیکھی طاقت کا انکار کردیتی ہے، محض اس بنا پر کہ وہ ہماری زندگی کے کسی مرحلے میں ہمارے انسانی فہم وادراک سے پرے تھی! اس طرح ہمارا فہم اس کائنات کے مقابلے میں حجم، طاقت اور قدروقیمت کے اعتبار سے چھوٹا ہوجاتا ہے اور 'معلوم' کی حدود سے گھر جاتا ہے۔ اور وہ اس لمحے تک، جب کائنات کی عظمت سے اس کا مقابلہ کیا جائے، حقیر ـــــ انتہائی حقیر ہوتا ہے۔

اس روے زمین پر انسان کی زندگی، کائنات میں اللہ تعالیٰ کی قوتوں اور ان کے مظاہر کے فہم و اِدراک سے عاجز ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی ان قوتوں کے فہم وادراک پر قدرت کا تسلسل ہے۔ جب بھی انسان نے بندشوں سے چھٹکارا پایا اور اپنے طویل راستے میں آگے کی طرف قدم بڑھایا ہے، اسے ان قوتوں کا ادراک ہوا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کی ان قوتوں میں سے، جو کبھی انسان کے لیے نامعلوم اور اس کے اِدراک سے پرے تھیں، کسی قوت کے اِدراک پر اس کا قادر ہوجانا اس بات کی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی بصیرت سے دیکھ لے کہ کائنات میں دوسری بہت سی قوتیں ایسی ہیں، جن کا ابھی وہ اِدراک نہیں کرسکا ہے۔ اس لیے کہ ابھی تک وہ تجربے کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔

انسانی عقل کے احترام کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں 'نامعلوم' کو مناسب مقام دیں۔ اس لیے نہیں کہ ہم اپنے تمام معاملات اس کے حوالے کردیں، جیسا کہ اوہام وخرافات کے دل دادہ کرتے ہیں، بلکہ اس لیے تاکہ ہم حقیقی طور پر اس کائنات کی عظمت کا احساس کرسکیں اور اس وسیع وعریض کائنات میں اپنی قدروقیمت پہچان سکیں۔

اسی طرح اس کا یہ بھی تقاضا ہے کہ وہ انسانی روح کے لیے بہت سی قوتوں کے دروازے کھول دے، جس سے معرفت حاصل ہوسکے اور ان روابط کا علم ہوسکے، جو ہمیں اور ہماری داخلی دنیا کو اس کائنات سے جوڑے ہوئے ہیں۔ اس بات میں ادنیٰ سا بھی شک نہیں کہ یہ قوتیں ان تمام چیزوں سے زیادہ عظیم اور وسیع اور گہری ہیں، جن کا ہم نے اب تک اپنی عقلوں سے اِدراک کیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے سامنے ہر دن کسی نئے 'نامعلوم' کا انکشاف ہورہا ہے اور

ہم برابر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

بارھواں خیال: اللہ کی عظمت کا اعتراف اور انسان کی قدر و قیمت

اس زمانے میں بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مطلق عظمت کا اعتراف کرنے سے: ''انسان کی قدر و قیمت کم ہوجاتی ہے اور اس کائنات میں اس کی شان گھٹ جاتی ہے''۔ گویا اللہ اور انسان دو حریف ہیں، جو اس کائنات میں عظمت اور قوت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ایسا سوچنا محض جہالت ہے۔

میرا احساس ہے کہ جوں جوں اللہ کی مطلق عظمت کے بارے میں ہمارے شعور میں اضافہ ہوگا، اسی قدر ہمیں بھی عظمت حاصل ہوگی۔ اس لیے کہ ہم اس عظیم ہستی کی تخلیق ہیں۔

جو لوگ گمان کرتے ہیں کہ ان کا مقام اس وقت بلند ہوتا ہے، جب وہ اپنے خیال میں اپنے خالق اور معبود کا درجہ گرا دیتے یا اس کا مطلق انکار کر دیتے ہیں، تو یقین مانیے ایسے لوگ بے چارگی اور عقلی افلاس کی اس سطح پر گرے ہوئے ہیں کہ جو قریبی افق کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے۔

وہ گمان کرتے ہیں کہ انسان نے اپنے 'ضعف' اور 'عجز' کے زمانے میں اللہ کی پناہ حاصل کی تھی، لیکن اب، جب کہ وہ 'طاقت ور' ہوگیا ہے، اسے کسی معبود کی ضرورت نہیں! گویا کہ ضعف، بصیرت کے دروازے وَا کرتا اور طاقت وقوت اس پر خطِ نسخ پھیر دیتی ہے۔ انسان کے شایانِ شان یہ ہے کہ جوں جوں اس کی قوت بڑھے، اسی قدر اللہ کی عظمتِ مطلق کے بارے میں اس کے احساس میں اضافہ ہو۔ اس لیے کہ اس کی قوتِ ادراک میں جس قدر اضافہ ہوگا، اسی قدر وہ اس قوت کے سرچشمے کا بہ خوبی ادراک کر سکے گا۔

تیرھواں خیال: غلامی آزادی کے لبادے میں

بعض اوقات غلامی، آزادی کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور اس کا اظہار تمام پابندیوں سے آزادی، عرف اور روایات سے آزادی کی شکل میں ہوتا ہے۔

ذلت، دباؤ اور کم زوری کی قیود سے آزادی اور انسانیت کی قیود اور ذمے داریوں سے آزادی، دونوں کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ اول الذکر ہی حقیقی آزادی ہے، جب کہ دوسری

آزادی فی الواقع ان قدروں سے عاری ہونا ہے، جنھوں نے انسان کو انسان بنایا ہے اور اسے حیوانیت کی بھاری بیڑیوں سے آزاد کیا ہے۔ یہ بناوٹی آزادی ہے۔ اس لیے کہ یہ حقیقت میں حیوانی جذبات ومیلانات کے آگے خودسپردگی اور ان کی غلامی ہے۔ انسانیت نے ایک طویل عرصہ اس غلامی کی بیڑیوں کو کاٹنے اور آزاد فضا میں سانس لینے کی جدّوجہد کرتے گزارا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانیت اپنی ناگزیر ضروریات کے اظہار سے کیوں شرماتی ہے؟

دراصل وہ محسوس کرتی ہے کہ ان ضروریات سے بلند ہوجانا انسانیت کی اوّلین قدر ہے۔ اس کی بیڑیوں سے نجات پانا ہی حقیقی آزادی ہے۔ گوشت اور خون کے محرکات پر غلبہ پانا اور کم زوری اور ذلّت کے اندیشوں پر قابو پانا، انسانیت کے مفہوم کو گہرا کرنے میں دونوں کا کردار برابر ہے۔

چودھواں خیال: بے عملی کا نظریہ، زندگی نہیں موت ہے

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو اصولوں کو افراد سے الگ کرکے پیش کرنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ حرکت وعمل پر آمادہ کردینے والے اور حرارت بخش عقیدے کے بغیر اصول کی کوئی حیثیت نہیں، اور ایسا عقیدہ انسان کے دل کے علاوہ اور کہیں کیوں کر پایا جاسکتا ہے؟

اصول اور افکار اگر حرکت وعمل پر آمادہ کردینے والے عقیدے پر مبنی نہ ہوں تو وہ محض کھوکھلے الفاظ ہیں، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بے جان معانی ہیں۔ جو چیز ان کو زندگی بخشتی ہے وہ ایمان کی حرارت ہے، جو کسی انسان کے دل سے نکلتی ہے۔ دوسرے لوگ ہرگز کسی ایسے اصول یا نظریے پر ایمان نہیں لائیں گے، جو کسی حرارت بخش دل میں نہیں، بلکہ جذبے اور اعلیٰ احساس سے عاری ذہن میں پیدا ہوا ہو۔

پہلے تم خود اپنے نظریے پر ایمان لاؤ۔ اس پر تمھارا ایمان حرارت بخش عقیدے کی حد تک ہو! تبھی دوسرے لوگ بھی اس پر ایمان لائیں گے، ورنہ اس کی حیثیت محض چند کھوکھلے الفاظ کی ہوگی، جو روح اور زندگی سے عاری ہوں گے۔

اُس نظریے کے لیے کوئی زندگی نہیں جو کسی انسان کے سانچے میں نہ ڈھلا ہو اور جس نے کسی ایسے زندہ وجود کی شکل نہ اختیار کی ہو، جو روے زمین پر کسی انسان کی صورت میں چلتا پھرتا ہو۔ اسی طرح اِس میدان میں اُس انسان کا بھی کوئی وجود نہیں ہے، جس کے دِل میں کسی ایسے نظریے نے

گھر نہ کیا ہو، جس پر وہ حرارت اور اخلاص کے ساتھ ایمان رکھتا ہو۔

نظریے اور فرد کے درمیان فرق کرنا، روح اور جسم یا معنی اور لفظ کے درمیان فرق کرنے کا ہم معنی ہے۔ بسا اوقات ایسا کر پانا ناممکن ہوتا ہے۔ اگر نظریے کو فرد سے الگ کر دیا جائے، تو اکثر وہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ صرف اسی نظریے کو زندگی ملتی ہے، جس کی پرورش انسان کے خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ رہے وہ افکار جو اس پاکیزہ غذا سے محروم رہتے ہیں، وہ مردہ ہوتے ہیں اور ان میں انسانیت کو ایک بالشت بھی آگے بڑھانے کی سکت نہیں ہوتی۔

پندرھواں خیال: گھٹیا ذریعے سے پاکیزہ مقصد کا حصول درست نہیں

میرے لیے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ ہم کسی گھٹیا وسیلے کو کام میں لا کر کسی پاکیزہ مقصد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ پاکیزہ مقصد کسی پاکیزہ دل ہی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ پھر اس دل کے لیے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ کسی گھٹیا وسیلے کو بروئے کار لانے کو گوارا کرے؟

ہم جب کسی سرسبز و شاداب علاقے میں پہنچنے کے لیے کسی کیچڑ بھرے راستے سے ہو کر گزریں گے، تو ضروری ہے کہ اپنی منزل تک کیچڑ میں لت پت ہو کر پہنچیں۔ کیچڑ سے ہمارے پیر بھی گندے ہو جائیں گے اور وہ جگہیں بھی، جہاں ہمارے پیر پڑیں گے۔ یہی حال اس وقت ہوگا، جب ہم کوئی گھٹیا اور گندا وسیلہ اختیار کریں گے۔ گندگی ہماری روحوں سے چپک جائے گی اور اس کے اثرات ہماری روحوں پر بھی پڑیں گے اور اس مقصد پر بھی جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

روح کے معاملے میں وسیلہ مقصد کا ایک جز ہے۔ عالمِ روح میں یہ امتیازات اور تقسیمیں نہیں ہوتیں۔ صرف انسانی شعور ہی ایسا ہے کہ جب اس میں کسی پاکیزہ مقصد کا احساس پیدا ہوتا ہے، تو وہ ہرگز کسی گھٹیا وسیلے کو اختیار کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فطری طور پر وہ ہرگز اسے اختیار نہیں کرے گا۔

''مقصد حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی وسیلہ اختیار کیا جا سکتا ہے'' ـــــ یہ مغرب کا عظیم فلسفہ ہے! اس لیے کہ مغرب کی عظمت کا پرتو اپنے ذہن و دماغ کی شکست خوردگی کی وجہ سے ہے۔ وسائل اور مقاصد کے درمیان تقسیم اور فرق کرنا ذہنی طور پر ہی ممکن ہے، عمل کی دنیا میں نہیں۔

(کتابچہ منشورات سے دستیاب ہے)